Fikr-o-Nasar (Islamabad) 46:1,2 (2008)

فکر و نظر............ اسلام آباد   جلد: ۴۶   شمارہ: ۱، ۲

''نعت اور تنقیدِ نعت'' کا اجمالی جائزہ

افتخار الحسن میاں

عصرِ حاضر کے ادیبوں، شاعروں، نقّادوں اور اُردو کے اساتذہ میں ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی مرحوم فخرِ موجودات ﷺ کی ذات والا صفات اور آپؐ کے متعلقات سے محبت و عقیدت، آپؐ کے مقاصدِ بعثت کی روشنی میں آدابِ نعت کے فروغ اور عمر بھر شجرِاسلام کی آبیاری کے حوالے سے اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ اُردو کی ترقی پسند تحریک جو ۱۹۱۷ء میں روس کے اشتراکی انقلاب کے زیراثر اُبھری اور اس کے انجام کے ساتھ ہی دم توڑ گئی، اس کے زمانۂ عروج میں جب بڑے بڑے ادیب اپنی ادبی صلاحیتیں اشتراکیت کے نام کیے ہوئے تھے اور بڑے بڑے شعراء نعت گوئی سے اس لئے گریزاں رہتے تھے کہ اس سے اُن کے شعر و ادب میں مقام پر حرف آ سکتا ہے، اُن دنوں بھی کشفی مرحوم اپنی نعتیہ شاعری اور آدابِ نعت پر اپنی تحریروں کے ذریعے فروغِ عشقِ رسول ﷺ کا علَم سربلند رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی ذات کا حوالہ کسی وقتی تحریک کو بنانے کے بجائے اپنی حیاتِ مستعار کو رحمتِ دو جہاں ﷺ کے نام کر کے حیاتِ جاوداں کا راز پا لیا تھا۔

اُن کی تصانیف ''تعارفِ اسلام''، ''مسلماں کی زندگی کیا ہے؟''، ''وطن سے وطن تک''، ''حیاتِ محمدی ﷺ-قرآن حکیم کے آئینے میں''، اُن کی شاعری کا مجموعہ ''نسبت'' اور زیرِ نظر کتاب ''نعت اور تنقیدِ نعت'' میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کے اس آفاقی شعر کی گونج سنائی دیتی ہے:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

کشفی مرحوم کی ہر کتاب نشرِ اسلام اور فروغِ عشقِ رسول ﷺ کا دلنشیں عنوان ہے۔ جبکہ ''نعت اور تنقیدِ نعت'' اُن کے اس توانا احساس کی ترجمان ہے کہ نعت کو شاہِ کونین ﷺ کی محبت، آپؐ کے مقاصدِ بعثت، قرآن حکیم اور سیرتِ طیبہ کے موضوعات، آپؐ کی ذات اور متعلقات کے حدود میں رہ کر اپنا ارتقائی سفر کرنا چاہیے۔ وہ نعت گو شعراء کے لئے قرآن حکیم اور سیرتِ طیبہ کا وسیع مطالعہ ناگزیر قرار دیتے ہیں تاکہ نعت افراط و تفریط کے رویوں سے بلند و بالا رہے۔ (صفحات ۳۰، ۳۱، ۴۳) یہ اتنی سچی اور اہم بات ہے کہ اس کی رعایت کرنے سے نعت مسلمانوں کے مختلف خیال

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.   http://iri.iiu.edu.pk/

و ذوق کے حامل افراد کو نظری الجھاؤ سے نکال کر وحدت کی اس لڑی میں پرو سکتی ہے جس کے لئے حضورﷺ رونق افروزِ عالم ہوئے تھے۔ اُن کی نظر میں نعت وحدتِ امت کا استعارہ ہے۔

''نعت اور تنقیدِ نعت'' ڈاکٹر کشفی کے نعت کے مختلف پہلوؤں پر اُن علمی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں نعت کے ممتاز خدمت گزار محترم صبیح الدین رحمانی کی درخواست اور فرمائش پر اُن کے معروف مجلّہ ''نعت رنگ'' (کراچی) کے لئے تحریر کیے تھے۔ اس لئے کتاب کا انتساب اُنہی کے نام ہے۔ ۱۷۳ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں پہلی بات کے عنوان سے مختصر تعارف کے بعد چار تنقیدی مضامین شامل ہیں: نعت کے عناصر، نعت کے موضوعات، نعت گنجینۂ معنی کا طلسم اور غزل میں نعت کی جلوہ گری۔ جبکہ پانچواں مضمون 'ہیں مواجہ پہ ہم' وصال و فراقِ محبوب کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے نازک احساسات و تاثرات کا بیان ہے۔ مشمولاتِ کتاب میں ایک امید افزا ریڈیائی فیچر بھی ہے۔ اِس کا عنوان ہے: اُردو میں نعت کا مستقبل۔

زیرِنظر کتاب کے پہلے مضمون 'نعت کے عناصر' میں ڈاکٹر کشفی نے آغازِکلام اُردو کی عام شاعری کے اُن عناصر کے ذکر سے کیا ہے جو اس کی نعتیہ شاعری کے بھی اجزائے ترکیبی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تخیّل، مطالعۂ کائنات اور الفاظ کی جستجو کو انہوں نے مولانا الطاف حسین حالی کے الفاظ میں شاعری کے اجزائے ثلاثہ قرار دیا ہے۔(ص ۱۵) شاعری میں الفاظ کا انتخاب نہایت اہم ہوتا ہے۔ اِن کی خاص آہنگ سے بندش اِنہیں شعر بناتی اور نثر سے الگ شناخت عطا کرتی ہے۔ شاعر مطالعۂ کائنات سے اپنے تخیل کا ارتقائی سفر کرتے ہوئے جب کسی لطیف نکتہ سے ہمکنار ہوتا ہے تو اسے الفاظ کے پیکر ہی میں پیش کرتا ہے۔ الفاظ کا خلّاقانہ استعمال اور اُن کی بلاغی قوت شعر کو موسیقیت عطا کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں شعر اپنے قارئین و سامعین کے لاشعور میں بھی جگہ بنا لیتا ہے۔ بچپن میں سُنے ہوئے ایسے اشعار عمر بھر انسان کو اپنے لاشعور کے دریچوں میں گنگناتے سنائی دیتے ہیں۔ بندشِ الفاظ بھی جب رنگ جماتی ہے، جب شاعر کا تخیل زندہ و بیدار اور مطالعۂ کائنات وسیع و عمیق ہو۔ تاہم عام شاعری سے نعتیہ شاعری کو جو عنصر امتیازی شان عطا کرتا ہے، وہ جذبۂ عقیدت و محبت ہے جو شاعر کے دل میں ذاتِ رسالت مآبﷺ کے لئے موجزن ہوتا ہے۔ یہ جذبہ شاعر کے طائرِ تخیل کو عجب طاقتِ پرواز عطا کر کے نئی رفعتوں سے آشنا کرتا ہے۔ یہ جذبہ جس قدر توانا اور سچا ہوتا ہے، شاعر کا تخیل اُسے اسی قدر جانِ دو جہاںﷺ سے قریب کر دیتا ہے۔ اِس پاکیزہ تخیل کی قوتِ پرواز کو ترجمانِ حقیقت علاّمہ محمد اقبالؒ نے بالِ جبریلؑ سے تعبیر کیا ہے جس سے شاعر زمان و مکان کے فاصلے چشمِ زدن میں طے کر کے خود کو حبیب کبریا علیہ التحیۃ والثناء کے حضور دست بستہ

محسوس کرتا ہے جو اہل ایمان کو اپنی جانوں سے بھی عزیز و محبوب اور قریب تر ہیں۔ زُلف و گُل و رُخسار کے حصار میں سرگرداں عام شاعری میں تخیل اُن رفعتوں کو چُھوتا بھی نہیں جو رفعتیں نعتیہ شاعری کے مقدّر میں لکھ دی گئی ہیں۔ شاعر اور نقّاد خود اِس مبارک تجربہ سے گزرا ہو تو اُس کی نظر و تخیل کی وسعتوں کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ کشفی مرحوم کے الفاظ میں اس روح پرور کیفیت کا بیان سنئے:

> ''یہ تخیل ہی ہے جو ہمارے لیے فاصلوں کو پاٹ دیتا ہے۔ نعت گو شاعر کا تخیل اگر فعّال اور متحرک ہے تو وہ اسے نبی اکرمﷺ کے دور کے مدینے میں پہنچا دے گا۔ وہ اپنے آپ کو بزمِ رسالت میں نفس گم کردہ اصحاب کے درمیان بیٹھا ہوا یا دست بستہ کھڑا پائے گا۔ وہ ایک عظیم تجربے سے گزرے گا۔ آفتاب رسالتؐ کی شعاعیں اس پر پڑ رہی ہیں اور ان کرنوں سے اس کا وجود بدل رہا ہے۔ انؐ کی موجودگی کا احساس حقیقی ہے مگر نگاہیں دیدارِ جلوہ کے لیے اٹھنے کی ہمت نہیں کرتیں۔ بس موجودگی کا احساس ہی آدمی کو بدل رہا ہے۔'' (ص ۱۶)

نعت گو شاعر کا تخیل زمان و مکان کے فاصلے پاٹ کر قُرب کی اس منزل کو اُسی صورت میں پا سکتا ہے جب وہ مقامِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کا عرفان رکھتا ہو۔ وہ بجا طور پر اس عرفان کا سرچشمہ قرآن حکیم اور حاملِ قرآنﷺ کے ارشادات و احادیث کو قرار دیتے ہیں جن کے عمیق مطالعہ کی طرف اس پوری کتاب میں وہ نعت گو شعراء کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ مطالعۂ کائنات کو عام شاعری کی طرح نعتیہ شاعری کا اہم عنصر قرار دیتے ہوئے اس کا تعلق بھی سرکارِ دوعالمﷺ سے جوڑتے ہیں۔ کیونکہ نعتیہ شاعری اسی تعلق کے اظہار کا نام ہے۔ محض ہم وزن، ہم جنس، اور ہم قافیہ لفظوں کو جوڑنے کا عمل نعتیہ شاعری کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ محترم کشفی قرآن و سنّت اور مطالعۂ کائنات سے جس حقیقت تک اپنے شعراء کی رسائی ممکن بنانا چاہتے ہیں، وہ حقیقتِ محمدی علی صاحبہا الصلاۃ والسلام ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''جب شاعر مختلف مظاہر و مناظر سے گزر کر اُن کے بطون تک پہنچتا ہے تو وہاں اسے حقیقتِ محمدیؐ جلوہ گر نظر آتی ہے''۔ (ص ۱۳-۴)

ڈاکٹر کشفی نے اس کتاب میں جدید شعراء کی اصلاحِ فکر کا فریضہ عمدگی سے نبھایا ہے۔ اس کے لئے وہ نبی مکرمﷺ کی محبت کی کسوٹی پر اُن کے کلام کو پرکھتے ہیں اور جہاں افراط و تفریط کے رویوں کا اظہار دیکھتے ہیں، اس کی نشان دہی اور اصلاح ایک شفیق استاد کے طور پر کرتے ہیں۔ انہیں جدید نعت میں حضور نبی اکرمﷺ کے لئے ایسے اسماء کے اختیار کرنے پر خاصے تحفظات ہیں جو

قرآن و سنّت سے ماخوذ نہ ہوں اور شاعر نے دوسروں سے الگ اپنی راہ بنانے اور جدت طرازی کے شوق کی تکمیل کے لئے دوسرے غیریقینی مآخذ سے وہ نام لیے ہوں۔ اس سے عبدالعزیز خالد کی نعتیہ شاعری کی طرف ذہن جاتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے خالد کی اس منفرد صنعتِ اسماء کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:

''اُن کی نعت گوئی کا رنگِ انفرادیت اُن کے نعتیہ مجموعوں کے نام ہی سے جھلکتا ہے۔ مثلاً فارقلیط، منحمنا، حمطایا، ماذ ماذ اور عبدہٗ وغیرہ۔ خالد کے نعتیہ مجموعوں کے نام حضور اکرمؐ کے اُن اسمائے مبارکہ سے ماخوذ ہیں جن کا ذکر کتب سابقہ اور صحائف آسمانی میں آیا ہے۔ خالد نے ان اسمائے صفات کی معنوی وسعت و رفعت اور بلاغت کے سبب انہیں از سرِ نو متعارف و روشناس کرایا اور اُردو میں ان کی ترویج کی۔ عصرِ حاضر کے نعت گو شاعروں میں حضورؐ کے اسمائے صفات کا ذکر اور تلاش خالد کے اسی ذوقِ اختراع و اجتہاد کا مرہونِ منّت ہے۔ (اُردو میں نعت گوئی، ص ۵۰۰)

خالد کی یہ روش جدید نعت گو شعراء میں خاصی سرایت کر گئی جس کو محترم کشفی تحسین کی نظر سے نہیں دیکھتے مگر انہوں نے جدید نعتیہ شاعری میں خالد کی پیروی میں کہے گئے اشعار بطور نمونہ دینے بھی مناسب نہیں سمجھے۔ شاید وہ صرف اس بات پر زور دینا کافی سمجھتے ہیں کہ غریب اور نامانوس کلمات کو اسماء النبیؐ کے طور پر شعر میں ضبط کر کے نظری بحث چھیڑنے سے کہیں زیادہ محتاط طریقہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالٰی نے اپنے محبوب و مقبول رسولﷺ کو جن پرشکوہ اسمائے مبارکہ سے یاد فرمایا ہے یا جو اسمائے گرامی خود حضور شافع یوم النشورﷺ نے اپنے لئے پسند فرمائے ہیں، اُن کے عاشق شاعر بھی انہی کو پسند کریں اور اپنے نعتیہ کلام کو غیرضروری جدت طرازی کے رجحان سے پاک رکھیں۔(کشفی، ص ۳۰)

نعت کے موضوعات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر کشفی کہتے ہیں کہ یہ موضوعات مدینہ منورہ جانے کے ارادے، تمنا اور تڑپ کے اظہار تک محدود ہو چکے ہیں۔ یہ تمنا ہر مسلمان کے دل میں بسی ہوئی ہے۔ ہر مسلمان اس شہر کے ذرّوں کو بوسے دینے کی خواہش رکھتا ہے لیکن بہت کم شعراء اس تمنا کو شعر کی صورت میں پیش کر سکے ہیں۔ وہ تعجب کرتے ہیں کہ مدینہ کے فضائل کتبِ احادیث میں موجود ہیں مگر ہمارے بیشتر نعت گو شعراء ان فضائل سے بے خبر ہیں جبکہ ان فضائل سے نبی مکرمﷺ کی رفعتِ شان کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے سرکار دوعالمﷺ کے ایک ارشاد کا یہ ترجمہ درج کیا ہے کہ ''میں مدینہ کے دو کناروں کے درمیانی حصے کو حرم قرار دیتا ہوں''۔ اس سے اگلے چند فقرے

مدینہ منورہ کو نعتیہ شاعری کا بطورِ خاص موضوع بنانے کی طرف شعراء کو متوجہ کرنے میں بڑے مؤثر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ اختیار ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو عطا کیا اور اسی اختیار سے مدینہ بھی حرم ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس سے بے رغبتی کرنے والے کو اللہ تعالیٰ چھوڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ مدینہ میں اس شخص کو مل جاتی ہے جو مدینہ کی سختی اور مشقت پر صبر کرتا ہے اور ایسے ہر شخص کی سفارش اور گواہی سرورِ انس و جاںؐ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ (مسلم) مکّہ معظّمہ کو دعائے ابراہیمؑ اور تمنائے ابراہیم علیہ السلام نے حرم قرار دیا اور مدینہ منورہ کو اختیارِ محمد عربی ﷺ نے''۔(ص ۳۵، ۳۶)

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی اُردو کی نعتیہ شاعری میں صرف گنبد خضراء کے ذکر پر اکتفاء اور مسجد نبوی کے مجموعی حیثیت میں ذکر سے اغماض کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اُن کی یہ تنقیدی رائے حیران کن ہے کہ اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بس گنبد خضراء کو دیکھنے ہی مدینے گیا تھا۔ وہ گنبد جس کی تاریخ مشکل سے دو سو سال سے کچھ زیادہ ہے۔ نہ ستونوں کا تذکرہ، نہ صفہ کی علم آفرینی پر نظر، نہ مواجہ کی کیفیات کا ذکر۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ راقم الحروف [کشفی] کو اس گنبد، اس علامت کی اہمیت کا پورا پورا احساس بلکہ ادراک ہے لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ ہمیں مسجد نبوی کو مجموعی طور پر دیکھنا ہوگا۔(ص ۳۹)

گنبد خضراء کے جلووَں سے نعتیہ شاعری میں جو رعنائی آئی ہے وہ اس قُرب کی رہین منّت ہے جو باقی اور مجموعی مسجد نبوی کی نسبت اسے شاہِ دو سرا ﷺ کے جسدِاطہر سے حاصل ہے۔ قربِ نبی ﷺ کا یہی وہ توانا احساس ہے جو خود محترم کشفی کو مواجہ کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ جو کیفیاتِ قرب وہ مواجہ اور اس کی سنہری جالیوں کے سامنے محسوس کرتے ہیں، وہ انہیں مسجد نبوی میں وضو کرتے شاید حاصل نہ ہوئی ہوں۔ فاضل نقّاد نے گنبد خضراء کی تعمیر کا عہد متعین کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس کی وضاحت نہیں کی کہ مواجہ گنبد خضراء کی تعمیر سے کتنی صدیاں پہلے سے عشّاق کے قلب و نظر کو منوّر کر رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح نعت نہایت نازک اور مشکل صنفِ سخن مانی گئی ہے کہ اس راہ پر بڑے بڑے شعراء کو اپنے عجز کا اعتراف کیے بغیر نہیں بنی۔ اسی طرح نقّاد اپنے عجز کا اعتراف خواہ لفظوں میں نہ بھی کرے، یہ عجز عیّاں ہوئے بغیر رہتا نہیں۔ اُن کی یہ تنقید بھی محلِ نظر ہے کہ نعت گو شعراء صرف گنبد خضراء کا ہی ذکر کرتے ہیں، اس کے ستونوں، صفّہ اور مواجہ کا ذکر نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسجد نبوی کے مناروں، منبرِ رسول ﷺ اور در و بامِ مسجد نبوی کا ذکر

جدید نعتیہ شاعری کے عام موضوعات ہیں۔ جدید نعتیہ شاعری کا عہد قیامِ پاکستان کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور گذشتہ تین دہائیاں اس کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس دور کے نامور نعت گو شعراء میں حافظ مظہر الدین کا نعتیہ کلام اہلِ محبت کو اسی کیف و سرور سے مالامال کرتا رہا ہے جو کشفی مرحوم کی تحریر ''ہیں مواجہ پہ ہم'' کا خاصہ ہے۔ حافظ صاحب مرحوم کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ''بابِ جبریل'' در و بامِ مسجد نبوی سے جدید شعراء کے جذب و عقیدت کا مظہر ہے۔ مواجہ یا روضۂ رسول کریم ﷺ کی جالیوں کے ذکر کے بغیر جدید نعت گو شعراء کو جیسے تشنگیٔ اظہار رہتی ہے۔ اس مضمون کے حامل اتنی بڑی تعداد میں نعتیں اور نعتیہ اشعار ملتے ہیں کہ انہیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم انتخابِ کلام وجود میں آئے۔ شاید کوئی باذوق کشفی مرحوم کی تسکینِ روح کے لئے اس جانب توجہ دے۔ اس تنقید میں کہ جدید نعت میں گنبد خضریٰ پر ہی شعراء کی نگاہ اُٹھ اُٹھ جاتی ہے اور وہ مسجد نبوی کو مجموعی کے طور پر نعت کا موضوع نہیں بناتے۔ (ص ۳۹) اور اس کے علاوہ پوری کتاب میں وہ گنبد خضراء کو گنبد خضریٰ ہی لکھتے ہیں جو اس کی غلط املاء ہے۔(ص ۳۹) اکثر شعراء ید بیضاء، سوداء، حمراء اور زرقاء کی املاء میں غلطی نہیں کرتے۔ نہ جانے اس لفظ کی املاء میں کیوں بے دھیانی روا رکھی جاتی ہے۔

اُردو کی قدیم و جدید شاعری میں اگرچہ مدینہ منورہ ایک مرکزی خیال کے طور پر چھایا ہوا ہے۔ اس کے باوصف اس عاشقِ صادق کا دل چاہتا ہے کہ نگاہ بس اسی کے در و بام کی اسیر رہے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کی عظمت و فضائل پر شاہد حضور شاہ دو سرا ﷺ کے متعدد ارشادات کا خوبصورت ترجمہ کر کے مدینہ منورہ کی محبت کو اپنے نعت گو شعراء کے دلوں میں مزید راسخ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان میں سے دو ارشادات آپ بھی ملاحظہ کیجئے، وہ لکھتے ہیں:

> ''جب مدینہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت بلال حبشیؓ کو بخار آ گیا تو نبی اکرم ﷺ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: یا اللہ! جس طرح مکّہ ہمیں محبوب ہے، اسی طرح مدینہ کو ہمارے لیے محبوب بنا دے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اس کی آب و ہوا کو اعتدال عطا فرمانا اور اس کے وزن کے پیمانوں میں ہمارے لیے برکت عطا کر دے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث کے مطابق مدینہ بُرے لوگوں کو اسی طرح اپنے آپ سے دور کر دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔ (متفق علیہ)، (ص ۳۶)

یہی وہ ارشادات تھے جن سے آ گاہی کی وجہ سے ہمارے شعراء کرام نے اس مسکنِ نبوی کو اپنی نعتیہ شاعری کا جلی عنوان بنایا ہے۔ اُردو کی نعتیہ شاعری میں ذاتِ رسالت مآب ﷺ اور آپؐ کے

اس محبوب شہر کی محبت کے مبارک حوالوں نے ہی اسے نعت کا وسیع دبستان بنایا ہے۔ کشفی مرحوم کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں کہ بعض نعت گو شعراء کے یہاں بلاضرورت مدینہ منورہ کے جنت سے تقابل کی کوششیں نظر آتی ہیں۔ وہ اس کی وجہ قرآن حکیم میں جنت کے مرتبۂ عالی سے بے خبری کو قرار دے کر اُن آیات مبارکہ کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں ارشاد ہوا ہے کہ اہلِ ایمان کے تمام اعمال حسنہ کا اجر انہیں جنت کی صورت میں دیا جائے گا۔ جہاں وہ سالارِ اہلِ جنتﷺ کی قیادت و سیادت میں داخل ہوں گے۔ اسی طرح نعت کے موضوعات میں بعض غیرمحتاط شعراء کی جانب سے حضرت جبریل امین علیہ السلام کے استخفاف پر بھی وہ بجا طور پر تنقید کرتے ہیں۔ اُن کی محبت رسولﷺ یہ بھی گوارا نہیں کرتی کہ دیگر انبیاء کرام علیہم السلام سے فخرالرسلﷺ کا تقابل کیا جائے۔ بعض شعراء کے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ظرف پر اپنے ظرف کو فوقیت دینے کی مثالیں ہر سلیم الفطرت اور صاحبِ علم مسلمان پر بہت گراں گزرتی ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے ایسے قابلِ اعتراض اشعار کو بطور نمونہ بھی درج کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ محبت و عشقِ رسولﷺ کو قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ کے تابع رکھنے کی طرف شعراء کرام کی توجہ دلاتے ہیں تاکہ نعت کے موضوعات و مضامین افراط و تفریط سے پاک رہیں۔ اگر نعت کو سرکار دو عالمﷺ کے مقاصدِ بعثت کا ترجمان بنایا جائے تو قرآن حکیم، کتبِ احادیث و سیرت اور حیاتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں موجود موضوعات کا بحرِ بے کراں کسی تنگنائے کی طرف نکلنے نہیں دیتا۔ ''شاہنامۂ اسلام'' اور اس طرح کے دیگر شاہکار، شعراء کو سیرتِ طیبہ اور تاریخ اسلام کے بصیرت افروز واقعات کو نعتیہ شاعری کا موضوع بنانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ اُردو میں میلاد ناموں کا وسیع سلسلہ بھی نبیٔ رحمت، رافتِ مجسمﷺ کی ولادتِ باسعادت اور بعثت کے احسانِ عظیم پر صرف اظہارِ تشکر و امتنان ہی نہیں بلکہ انؐ کے پیغامِ نبوت و رسالت کے فروغ کا بھی باعث ہے۔ کشفی مرحوم نے اس کتاب میں اسی پیغامِ نبوت کی شاعری میں نمود کا درس دیا ہے۔

اس کتاب کا ایک بہت حسین پہلو اُردو شاعری کی سب سے طاقتور صنف غزل میں نعتیہ اشعار کا کھوج ہے۔ یہ درست ہے کہ غالب اور فیض ایسے کئی بڑے شعراء نے نعت کو اپنا خاص موضوع نہیں بنایا لیکن اُن کی غزلوں میں نعتیہ رنگ موجود ہے۔ کشفی مرحوم نے غزل میں نعت کی جلوہ گری کو بڑی خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔ پاکستانی معاشرہ میں فارسی سے عدم التفات کے باوجود غالب کی غزل کے یہ اشعار اُن کے دل میں موجزن محبتِ رسول اور مقامِ مصطفیٰﷺ کے آئینہ دار ہونے کی وجہ سے آج بھی تر و تازہ اور پوری طرح قابلِ فہم ہیں:

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کایں سخن ز سروِ روانِ محمد ست
غالب ثنائے خواجہؐ بہ یزدان گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ست

اہلِ محبت مدینہ منوّرہ سے جنت کا کیونکر تقابل کریں گے۔ وہ مدینہ منورہ سے دور رہ کر بھی اس کی معطر فضاؤں میں اس لئے سانس لینا عزیز جانتے ہیں اور اس کے ذکرِ خیر سے اپنے کلام معتبر بناتے ہیں کہ اس شہر کو جلوہ گاہِ رسولﷺ ہونے کا صد رشکِ جنت اعزاز حاصل ہے۔ اُن کی نظر میں جنت کا حسن بھی اسی وقت اپنے شباب و کمال کو پہنچے گا، جب حضور باعثِ تکوینِ کائناتﷺ اس میں جلوہ افروز ہوں گے۔ اسی شاہکارِ ازل کے دیدار کی آرزو اُن کے دلوں میں جنت کی تمنا جگاتی ہے۔ غالب کا یہ نعتیہ شعر انہی احساسات کا ترجمان ہے:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو

نعت کی پرکھ کا ایک اصول خاص کشفی مرحوم کی ایجاد ہے کہ جب کوئی شعر، اپنے موضوع اور مخاطب سے بڑا ہو تو اس کا مصداق سرور کائنات علیہ الصلاۃ والسلام بن جاتے ہیں۔(ص ۳۴) وہ لکھتے ہیں کہ جب غالب نے تجمّل حسین خاں کے لیے یہ شعر لکھے تھے تو انہیں کیا خبر تھی کہ ان کا ممدوح ان شعروں سے فرو تر ہے اور ان شعروں کی نسبت اس ذات عالیہ سے قائم ہو جائے گی جس کے مرتبۂ بلند کی ایک جھلک ان الفاظ کے آئینوں میں نظر آتی ہے:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

(ص ۳۴)

غالب کا یہ شعر بھی اتنا بلند ہے کہ سوائے نعت و میلاد رسولﷺ کے کوئی اس کا عنوان اور مصداق ہو نہیں سکتا:

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل ، رہ گزر میں گرد نہیں

ڈاکٹر کشفی صاحب غزل کے ذومعنیٰ اشعار میں رنگِ نعت کی نشاندہی شاعر کے مجموعی مطالعہ و فہمِ ذات کی بناء پر کرتے ہیں۔ اس میں ان اشعار کو دیکھنے اور پرکھنے والے کی اپنی حسنِ نظر کی کرشمہ فرمائیوں کو بھی دخل ہوسکتا ہے مگر غالب کا معاملہ اور ہے۔ اسے تو ناز ہی اس پیکرِ جمالؐ کی غلامی پر ہے جس کے طفیل صرف اس دنیا میں ہی بگڑے کاموں کے سنورنے کی اسے امید نہیں بلکہ آخرت میں بھی وہ اُنؐ کی نظرِ کرم کے امیدوار ہیں۔ غالب کا یہ شعر حضورؐ کے ہر امتی کی ترجمانی کر رہا ہے:

اس کی امت میں ہوں میرے بھی رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہؐ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

فیض احمد فیض جدید اُردو شاعری کا نہایت معتبر حوالہ ہیں۔ کشفی صاحب کو لینن گراڈ یافتہ اس عظیم شاعر سے شکوہ تھا کہ انہیں اُن کے کلام میں کوئی نعت نظر نہیں آئی۔ ایک نشست میں فیض صاحب نے اُن کی توجہ اپنے نعتیہ اشعار کی طرف دلا کر انہیں حیران کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے ہمدردی اور دلِ بیدار کے ساتھ میری غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو نعت کے اشعار مل جاتے اور اس مختصر گفتگو کے بعد انہوں نے اپنا یہ شعر پڑھا:

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

(ص ۱۰۲)

کشفی مرحوم نے اس واقعہ کو مِن و عَن درج کر کے مسلمانوں کی صدیوں سے جاری ضبطِ روایت کی منفرد شان کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ فیض صاحب کے تین اور نعتیہ اشعار ہدیۂ قارئین ہیں:

رنگ و خوشبو کے، حسن و خوبی کے
تم سے تھے، جتنے استعارے تھے

☆

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حُسن دستِ عیسیٰؑ، تری یاد روئے مریمؑ

☆

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہ گزر میں ہے

آخری شعر میں پیغامِ نبوت اور اتباعِ رسول مقبولﷺ کو عرفانِ الٰہی کی واحد سبیل قرار دے کر فیض صاحب نے دہائیوں پر محیط صحرا نوردی کے بعد اپنا رخ پھر سوئے حرم کر لیا ہے۔ کشفی مرحوم نے فیض صاحب کے ان نعتیہ اشعار کا کھوج لگا کر اُردو غزل کے مطالعہ کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔

☆☆☆☆☆